

ارشد محمود ناشاد

جدید اور قدیم کے سنگھم پر دو چیزوں کا ملاپ کبھی بے الاپ نہیں ہوتا۔ سُر اور گُر کے اُتار چڑھاؤ اور بہاؤ گیان اور نروان سے تبھی با پہچان ہوتے ہیں جب وہ اپنے صحیح اور صادق نردبان کی طرف بڑھیں؛ تب راگ کی ایک سچی شکل شبھاش اور شوبھا سے گزرتی ہے۔ یہی معاملہ شبد (لفظ) کے ساتھ بھی ہے۔ شبد کی سہانتا اور کانتا کا مظہر اُس وقت اظہر ہوتا ہے جب اُس کی سچائی اور پارسائی اپنی اصل دل رُبائی کی طرف گام زن ہو۔ شبد کے انتخاب کا یہ کھیل ـــــ میں نے جگہ جگہ ارشد محمود ناشاد کی شاعری میں رابیل ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ ارشد محمود ناشاد کی شاعری میں استعارے اور اُن کے گوشوارے، علامتیں اور اُن کی استقامتیں، کنائے اور اُن کے سچے پیرائے، قدم قدم پر ایک دوسرے کے ہمسائے ہیں۔ ایک دوسرے کے دردوں کو چھانٹنے اور بانٹنے کے لیے۔ ارشد محمود ناشاد کا مجموعۂ کلام ''رنگ'' ہماری مرصع غزل کے درِ کمال کو کھول رہا ہے تاکہ بہت جلد وہ اپنے مقامِ وصال تک پہنچ سکے۔ سفرِ عشق میں اُن کی اس لامنتہائی لاگت کا میں پوری فراخ دلی سے سواگت کرتا ہوں۔ اُن کے ان اشعار کا ہم نوا ہو کر:

کوئی تو ہے جو مری روح میں چمکتا ہے
کوئی تو ہے جو مرے فکر کی کتاب میں ہے
خدا کرے کہ مری روح میں اُتر آئے
وہ سیلِ درد کہ جو عشق کے نصاب میں ہے

ـــــ سیّد ناصر شہزاد

بسم الله الرحمن الرحیم

رنگ

اُسی کے فیض سے میرا ہُنر چمکتا ہے
مری غزل میں ہیں جس حُسنِ بے مثال کے رنگ

رنگ

ارشد محمود ناشاد

سرمد اکادمی، اٹک

ضابطۂ اشاعت

کتاب	:	رنگ
شاعر	:	ارشد محمود ناشاد
سرورق	:	عجب خان
تصاویر	:	ملک مشتاق عاجز
حروف چینی	:	فهد کمپوزرز، اسلام آباد
ناشر	:	سرمد اکادمی، اٹک
سالِ اشاعت	:	جنوری ۲۰۰۹
قیمت	:	۱۵۰ روپے

ملنے کے پتے:

کتب خانہ مقبولِ عام، اردو بازار اٹک شہر

اظہار سنز، ۱۹۔ اردو بازار، لاہور

صہیب سروسز، میونسپل پلازا، اٹک شہر

فروغِ ادب اکادمی، ۸۸۔ سیٹلائٹ ٹاؤن، گوجرانوالہ

خاک

کے

نام

فریدا ! خاک نہ نِندیئے، خاکو جیڈ نہ کوءِ
جیوندیاں پیراں تلے ، مویاں اُپر ہوءِ

چشمِ اُمید نداریم ز کشتِ دگراں

دلِ ما دانۂ ما ، نالۂ ما ریشۂ ما

———— بیدل

سلکِ دُرر

مقدّمہ

غزل بڑی جابر صنفِ سخن ہے۔ اگر غزل گو حریفِ پنجہ کش نہ ہو تو پھر اس کی وہ فضیحتی کرتی ہے کہ بھانڈ بنا کر چھوڑتی ہے۔کچھ خوش نصیب البتہ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اُن کی خوش نوائی کو برداشت کر لیتی ہے۔ ان کے ظرف کا امتحان نہیں لیتی۔ ''رنگ'' کا شاعر غزل کا چیلنج قبول کر لینے والے شاعروں کی صف میں شامل ہونے کے لیے کوشاں ہے یہ اجمال قدرے تفصیل طلب ہے:

پروفیسر حمید احمد خاں نے بیدل کے ہاں سے دو حکایتیں نقل کی ہیں۔ایک تو یوں ہے کہ کسی شخص کو اپنے ہی گھر میں ایک طاقچے میں پڑا ہوا آئینہ مل گیا؛اس میں اپنا عکس دیکھا تو اس پر فریفتہ ہو گیا۔ مگر تھوڑے دنوں بعد ''از قضا را آئینہ چینی شکست'' کی نوبت آئی تو اس آئینہ گزیدہ کی حالت دگر گوں ہو گئی۔آئینے میں جھلکنے والی صورت کی دید کو ترستا تھا۔اس پر احباب نے جب اسے اصل صورتِ حال سے آگاہ کیا،تو اسے تسکینِ خاطر نصیب ہوئی۔دوسری حکایت یوں ہے کہ: ایک بچہ کنوئیں کے کنارے بیٹھا روٹی کھا رہا تھا،روٹی کا ٹکڑا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر

کنوئیں میں گر گیا۔ بچہ رونے لگا تو اس کا والد لپک کر آیا، کنوئیں میں جھانکا تو روٹی کے ٹکڑے کے ساتھ اپنی صورت بھی نظر آئی۔ غصے کے عالم میں گرجنے لگا کہ:

''اے شیطان ! یوں دھوکا دے کر روٹی کھانے سے تو گندگی کھا لینا بہتر ہے۔''چناں چہ غزل اگر آئینہ ہے تو غزل گو اس میں اپنے عکس سے یا تو علاحدگی اختیار کر لیتا ہے اور سنبھل جاتا ہے۔ تصویر اور تصویر گر کا امتیاز قائم ہو جاتا ہے اور بہ صورتِ دیگر عمر بھر اپنے عکس سے الجھتا رہتا ہے۔ مثلاً غالب نے جب اپنے سخن فہم احباب کا مشورہ قبول کر لیا تو یہ کہہ کر سنبھل گیا کہ ''قدرِ شعرِ من بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن'' اور ایک ولایتی سے گالی کی صورت میں داد پا کر خوش رہا۔ اقبال کو عافیت تہمتِ شعر و سخن میں نظر آئی۔ ''رنگ'' میں یہ مضمون یوں بندھا ہے:

اپنے وجودِ اصل کو خود سے علاحدہ رکھا
نغمۂ خام کی طرح لہجۂ چنگ میں رہے
تلاشِ عکسِ گریزاں میں بارہا یہ ہوا
میانِ گردِ جنوں خود کو بھول جاتے رہے

آج وہ شاملِ یقین ہوا
کل تلک جو مرے گمان میں تھا

اس آخری شعر سے میرا دھیان اپنے ہاں کی ایک روایت کی طرف مبذول ہوتا ہے۔ جس کی رو سے ہر انسان کے ساتھ اس کا ایک ہم زاد بھی ہوتا ہے۔ ہم زاد کی تسخیر کے لیے کچھ عملیات کرنے پڑتے ہیں اور اگر ہم زاد تسخیر ہو جائے تو انسان بے پناہ قوتوں کا مالک بن جاتا ہے۔ آئینے کے سحر سے بچ نکلنے والا ہم زاد کو گویا مسخر کر لیتا ہے۔ اُسے ایک اعتماد حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کی آواز میں ایک توانائی نمو پاتی ہے۔ "رنگ" میں اس توانائی کی گونج سنائی دیتی ہے۔ اگرچہ اس کی لَے ابھی دھیمی ہے۔ تو بہر حال بات نرگسیت پر ٹھہرتی ہے۔ لیکن اس سے پہلے ایک منزل اور بھی آتی ہے۔ خواجہ حافظ شیرازی اور تصوف کے متعلق اختلاف سے پہلے زمانے کی بات ہے خواجہ حسن نظامی نے اقبال کو "سرّ الوصال" کے خطاب سے نوازا تو اقبال نے احتجاجاً کہا کہ خواجہ صاحب! مجھے "سرّ الفراق" کہیے۔ طریقت کے یہ رموز مجھ ایسے عامی کی دسترس سے باہر ہیں تاہم نفسیات اس

باب میں کچھ رہ نمائی ضرور بہم پہنچاتی ہے۔ بہ قول فرائڈ Ego ابتداً اپنے آپ کو چاہتا ہے۔ تاہم Id اسے عشق کے پردے میں Libido کے پیغامات بھیجتا رہتا ہے اور اس طرح Ego بالآخر اس قابل ہو جاتا ہے کہ ان پیغامات کو نرگسیت کے جبر سے نکال کر محبوب کی صورت میں ڈھال لے۔ میر نے بھی اس کی تصدیق کر دی ہے:

ہم آپ ہی کو اپنا مقصود جانتے ہیں
اپنے سوائے کس کو موجود جانتے ہیں

اب چاہنے والا اور چاہے جانے والا دو ہو جاتے ہیں۔ دو مستقل حقیقتیں بن جاتے ہیں۔ یوں وصل اور فراق کی کیفیتیں وجود میں آتی ہیں۔ جب تک نرگسیت سے مکمل آزادی حاصل نہیں ہو جاتی وصل کی ناکام خواہش چاہنے والے کو ایک مستقل عذاب میں مبتلا رکھتی ہے اور اس سے نجات اسے صرف بادہ و جام میں نظر آتی ہے۔ غزلیہ شاعری اکثر اسی کی ترجمانی کرتی ہے۔ غالب سے پوچھیے تو وہ اس قصے کو یوں بیان کریں گے:

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

مطلب ہے ناز و غمزہ و لے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

نرگسیت کی ایک خوش گوار کیفیت البتہ عرفانی تجلیات کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ ''اندر بوٹی مشک مچایا جاں پھلن تے آئی ہو''۔ لیکن عام حالات میں یہ لطافت بے کثافت جلوہ پیدا نہیں کرسکتی۔چناں چہ غزل میں دو مستقل کردار ابھرتے ہیں ایک عاشق اور دوسرا محبوب۔ پھر یہ کردار اپنے مجازی تلازمات ایجاد کر لیتے ہیں۔ جن کی فہرست طویل ہے۔ جسے یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں یہ مجازی تلازمات اپنی من مانی کرنے پر آجاتے ہیں تو غزل اپنی ایک الگ دنیا تعمیر کر لیتی ہے اور یہیں سے اس کا جبر پوری شدت سے ظاہر ہوتا ہے جس کا ذکر شروع میں ہوا تھا۔ پھر یہ جبر جب لفظ کے تشبیہی بلکہ صوتی اور مجازی (علم معانی و بیان والا مجاز) سلسلوں میں ظہور کرتا ہے تو کبھی کبھی نوبت ریختی تک بھی پہنچ جاتی ہے لیکن اکثر بات اس مقام سے پہلے کہیں رک جاتی ہے۔ سرِ دست اس بحث سے الجھنے کی ضرورت نہیں کچھ یوں بھی کہ یہ اسلوب اب کم و بیش متروک ہو چکا ہے دوسرے ''رنگ'' کے شاعر نے اس کوچے میں قدم نہیں رکھا۔

بیدل کی جن دو حکایات سے یہ قصہ شروع ہوا تھا ان کی معنوی حدود میں دو بنیادی کیفیات کو دخل ہے۔ایک معروضی حقیقت سے سمجھوتہ۔دوسرے موضوعی صورت حال کی خود فریب خوردگی میں استغراق۔کنوئیں میں گرے ہوئے روٹی کے ٹکڑے کو عمر بھر ترستا رہتا ہے۔ غزل نے بالعموم دوسری کیفیت کو قبول کیا ہے۔چناں چہ حسن و عشق اور ہجر و وصال کے مضامین اور ان کے متعلقات ہی سے غزل کا دامن آباد ہے۔پہلی صورت میں بھی شاعر انھی مضامین سے التفات کرتا ہے لیکن اس کے ہاں غزل کے کردار اپنی رسمی حیثیت آباد کرتے ہیں۔ مثلاً غالب نے کہا تھا:

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

لیکن اس کے برعکس اس مفعولی کیفیت سے آزاد ہو جانے والا یوں کہے گا:

اپنا کیا ہے کہ رہے یا نہ رہے
ہاں! مگر تیری ضرورت ہیں ہم

اُٹھائے پھرتے ہیں یہ زندگی کا بوجھ ،مگر
نہ کوئی چال نہ کوئی چلن سمجھتے ہیں



مرے ہنر سے ہوا متغیر جس کا بخت!!
یہ کیا کہ اس کی نظر میں بھی بے ہنر ہوا میں

نہ ماہِ چار دہم میں نہ آفتاب میں ہے
وہ روشنی جو مرے حسنِ انتخاب میں ہے

یوں کہیے کہ نرگسیت کے آئینے میں جو عکس تھا، ان اشعار میں اس کے برعکس وہ ذات زیادہ معتبر ہے جس کا عکس آئینہ میں جلوہ گر ہوا تھا۔ آئینہ کا عکس اپنی تمام تر اہمیت کے لیے آئینہ دیکھنے والے کا محتاج ہے، از خود کچھ بھی نہیں:

طلبِ غیر میں جو خود کو بھلائے ہوئے میں
جانے کس خاک سے وہ لوگ اٹھائے ہوئے میں

میں ترے شہر سے گزرا ہوں بگولے کی طرح
اپنی دنیا میں مگن اپنے خیالات میں گم

آخرش ہم جدا ہوں گے
میں ہوں اِک پھول۔ تو خوش بُو

یہاں ایک اعتماد ہے۔ اپنی ذات کے پھلنے پھولنے کی، بالیدگی کی تمنا انگڑائی لے رہی ہے۔ مسلکِ فنا کے برعکس بقا سے رابطہ استوار ہوتا نظر آ رہا ہے:

خاکِ خموش کو کبھی ولولۂ نمو بھی دے
باغِ خزاں گزیدہ کو لذتِ رنگ و بو بھی دے

ناتوانی میں بھی اِک کوہِ گراں کی صورت
گردشِ دہر! ترے مدِ مقابل رہے ہم

اجازت دے تو اے خاکِ کشادہ ظرف، ہم کو
ستاروں کا نگر پامال کرنا چاہتے ہیں

میرا سر کٹ کر مرے قدموں کے اوپر ہی گرا
میری ناکامی مری فتحِ انا ہونے لگی

اثباتِ ذات کے اس قرینے سے بعض ایسے مضامین وجود میں آئے ہیں جو روایتی سلسلۂ بانے مضامین سے معنوی اعتبار سے بھی مختلف ہیں اور ان کا اسلوب کسی حد تک نیا ہے۔ سراب اور دشت کے استعارے غزل میں نئے تو نہیں ہیں لیکن ان سے جو مضامین وجود میں آتے ہیں ان میں بے یقینی، ناکامی اور فریب

خوردگی کی کیفیتیں ہی جگہ پاتی ہیں۔ ''رنگ'' میں یہ استعارے بار بار آئے ہیں لیکن ان کی معنویت یا رمزیت پرانی روش کی پابند نہیں۔ اب ان میں ایک اعتماد ہے، امید کی ایک جھلک نظر آتی ہے:

زمینِ وہم سے نخلِ یقین پھوٹتا ہے
نشانِ موجۂ آبِ رواں، سراب میں ہے

لبوں پر تشنگی ہے دشت صورت
اور آنکھوں میں سمندر ناچتا ہے

پتا ناشاد نیلے پانیوں کا
مسافر کو سرابوں سے ملا ہے

اب پھر ایک دفعہ نرگسیت کے مثبت پہلو کی طرف لوٹتے ہیں اس کا اظہار ''رنگ'' کی غزلوں میں یوں ہو رہا ہے کہ 'قیس و کوہکن' کی 'قد و گیسو' میں آزمائش کا مضمون یہاں نظر نہیں آتا (دار و رسن کی آزمائش میں بھی افتادگی کا پہلو ہے اس سے بھی اعتنا نہیں کیا گیا) یہاں تک کہ ان متعلقاتِ جمال سے پیدا ہونے والے

استعارے بھی در نہیں آنے۔ حالاں کہ خالصتاً موضوعی سطح پر ان کے استعمال سے نادر پیرایہ ہائے بیان وجود میں آسکتے ہیں:

فرصتِ کش مکش مده این دلِ بے قرار را
یک دو شکن زیاده کن گیسوئے تابدار را

یہی اسلوب اپنے معروضی قرینوں کے ساتھ اظہار میں ایک لذیذ کیفیت پیدا کرتا ہے۔ مثال کے لیے غالب کے دہ شعر یاد کیجیے:

ع اِک نو بہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ

میں یہ تو نہیں کہتا کہ اس نوجوان شاعر نے ایک مرتاض راہب کی طرح عمداً ان مضامین سے اغماض برتا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس نوع کے استعارے اس کے حاشیۂ تخیل پر قدرتی طور پر ظاہر ہی نہیں ہوئے۔ استعارہ سہ گونہ تاثر کا حامل ہوتا ہے۔ اوّل: حسنِ بیان، دوم: معانی کا تصویری انتقال اور سوم: جذبات کی پردہ پوشی۔ ''رنگ'' میں ان میں سے کسی رنگ میں بھی محبوب کے جمالِ ظاہری کا استعارہ یا کنایہ زیبِ سخن نہیں بنتا۔ یہ گویا اس تصور کی نفی ہے جس کا اظہار تغزل کے لیے بعض اوقات شرط قرار دیا جاتا ہے۔ غزل کی تعریف یوں بھی کی جاتی رہی ہے۔ ذکرِ زناں

و ذکرِ عشقِ ایشاں۔ یا یہ کہ قصیدے کے ابتدائی اشعار جو تشبیب یا نسیب کہلاتے ہیں جب ایک علاحدہ صنفِ سخن بنے تو غزل کہلائے۔ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ غزال پر جب ہر طرف سے فرار کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں وہ دل دوز بے بسی کی آواز نکالتا ہے۔اس آواز کا سوز و ساز شعر میں ڈھلتا ہے تو غزل کہلاتا ہے۔ظاہر ہے یہ آواز حسن و خوبی کے تانیثی نزاکت کی حامل تو ہو سکتی ہے۔اس میں ایک سسکتی ہوئی بے بسی بھی ظاہر ہو سکتی ہے مثلاً محرومی کی یہ دلآویز کیفیت:

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے

حورانِ خلد میں تری صورت مگر ملے

اگرچہ اس میں ایک گونہ احتجاج بھی ہے لیکن بہت دبا دبا ،بہت سہا سہا۔

عربی قصیدے کی جلال آمیز مردانہ آواز غزل میں راہ نہ پا سکی۔ جدید دور میں بعض فن آشناؤں نے اقبال کے ہاں اس جلال کی نشان دہی کی ہے لیکن یہ صرف لہجے کی بات نہیں اس کے پیچھے جلالتِ مضمون بھی عمل فرما ہے۔ ''رنگ'' میں بھی ہمیں لہجے کی رقت کی بجائے ایک ملکے سے تہوّر کی کیفیت نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے ''اقبال کے ایک ممدوح نظیری'' کے حوالے سے لہجے کی اس توانائی سے

بحث کی ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اقبال نے دو ایک اس نوع کے شعروں پر لسان الغیب کے جملہ کمالِ فن کو رد کر دیا تھا:

گفت یزداں کہ چنیں است و دگر نیز مگو

گفت انساں کہ چنیں است و چناں می بایست

یا

گر فتم آں کہ بہشتم دہند بے طاعت

قبول کردنِ صدقہ نہ شرطِ انصاف است

اور ان کا یہ شعر جو اس ادبی رجحان کا ترجمان ہے تو زبان زد خلائق ہے:

بہ ملکِ جم نہ دہم مصرعِ نظیری را

کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست

''رنگ'' میں یہ لہجہ ابھی اس بھرپور توانائی کے ساتھ تو تشکیل پذیر نہیں ہوا تاہم یہ ضرور ہے کہ اس کا اندازہ کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے۔ اس لہجے کی تلاش تک دور جانے کی ضرورت نہیں، ''رنگ'' کی پہلی غزل میں اس کی شہادت بڑی واضح ہے:

خاکِ خموش کو کبھی ولولۂ نمو بھی دے

باغِ خزاں گزیدہ کو لذتِ رنگ و بُو بھی دے

اس رنگ کی اور بھی کئی غزلیں ہیں:

نئے موسم کی بشارت میں ہم

بزمِ امکان کی زینت میں ہم

ع ازل سے جو شریکِ درد و غم تھا وہ مقدر ڈھونڈتا ہوں

ع شورشِ دہر میں رہے، عرصۂ جنگ میں رہے

ع محبت کا سفر آغاز کرنا چاہتے ہیں (یعنی گریز نہیں جو عام مضمون ہے)

چیدہ چیدہ شعروں کے انتخاب سے میں نے عمداً گریز کیا ہے ورنہ مثالیں تو بہت مل جاتیں۔

ارشد محمود ناشاد کے ہاں جن رجحانات کا سراغ لگانے کی کوشش کی جا رہی ہے اس کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ ان کے ہاں مضمون آفرینی کے ساتھ ساتھ زبان کے استعمال میں لفظ کے لغوی معنوں کو مجازی تاویلات تک پھیلا دیا جاتا۔ یہ اسلوب اکثر اور خصوصاً فنی اظہار کے ابتدائی دور میں مشکل پسندی میں ڈھل جاتا ہے۔

شاعر اور قارئین دونوں کے لیے مشقت کا باعث بنتا ہے۔ لیکن یہی اسلوب جب اپنی فطری مناسبتوں کے ساتھ شعر میں ظہور پاتا ہے تو لطف سے خالی نہیں ہوتا۔ ''رنگ'' میں اس کے کچھ خوش گوار آثار نظر آتے ہیں جن سے اچھی توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں:

سنا کے طائرِ بے پر کو مژدۂ ہجرت
شجر شجر سے لپٹ کر مچل رہی ہے صبا

کون جھیلے گا وہ طغیانیِ ظرف
ذرہ خشک جو صحرا ہو جائے

عرصۂ وصل میں بھی حرفِ تمنا نہ کھلا
حسنِ الہام رہا پردۂ آیات میں گم

اس آخری شعر سے یاد آیا کہ لفظ عرصہ ''رنگ'' میں بہ کثرت وارد ہوا۔ اس میں ایک پھیلاؤ کی کیفیت ہے۔ لیکن میں ایک لفظ سے فن کے قرینے کی تعبیر لینے کا مدعی نہیں۔ تاہم فن ناآشنا جسے ''اضغاثِ احلام'' کہہ کر جان چھڑاتے ہیں۔ ان میں واقفانِ حال مستقبل کی تعبیر دریافت کر لیتے ہیں۔ مجھے صرف یہ کہنے کی اجازت

دیکھیے کہ فن میں ارشد محمود ناشاد نیک آثار کے ساتھ وارد ہوئے ہیں۔ ان کا ورود ایک نیک فال ہے کہ بہ قولِ فانی :

لیتے ہیں یہاں فالِ خبر ذوقِ خبر سے

ریاض احمد

حرفِ دعا

ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد نے اپنے مختصر مگر پرمغز مجموعۂ غزلیات کو ''رنگ'' کا نام دیا ہے اور پوچھا ہے:

یہ کس کے حسنِ نظر سے ہے کائنات میں رنگ؟

اقبال کا جواب یہ ہے:

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ

یہ رنگ بھی صرف ایک رنگ نہیں بل کہ ''نقش ہاے رنگ رنگ'' کا مرقّع ہے:

ہے عشق جنوں اور اس کے ہیں کتنے ہی رنگ

اگر کوئی شاعر اپنے رنگ کی پہچان کروا لیتا ہے تو کارگاہِ سخن میں اس کی بافت اس کی انفرادیت کی ضامن بن جاتی ہے۔ صاحبِ مجموعہ عام ڈگر سے ہٹ کر ایک خوش گوار تحیر پیدا کرنے کے ہنر سے واقف ہے:

یہ کیا کہ عہدِ بہاراں میں ہر شجر بے برگ
یہ کیا کہ فصلِ خزاں میں گلاب دیکھتا ہوں

اور پھر کس امید، تیقن اور اعتماد سے کہتا ہے:

شوقِ نمو کو ہم نے بکھرنے نہیں دیا
خوفِ زوال اڑان میں رکھا نہیں کبھی

زندگی اسی جواں ہمتی، پامردی اور عزیمت کا نام ہے۔ قدرت نے صاحبِ "رنگ" کو ان اوصاف سے بہرۂ وافر عطا کیا ہے جو اِس کے شعروں سے جا بہ جا جھلکتا ہے۔

خدا کرے کہ 'سروش' اِسے راہِ مضمونِ تازہ دِکھاتا اور "تیز ترک گامزن" کی صلا دیتا رہے۔

عبدالعزیز خالد

باب عقیدت

وہ کیا جہاں ہے جہاں سب جہاں اُترتے ہیں
وہ کیا زمیں ہے جہاں آسماں اُترتے ہیں

ترے چمن سے خزاں کا گزُر نہیں ہوتا
ترے چمن میں گلِ جاوداں اُترتے ہیں

بس ایک بار وہ شہرِ جمال دیکھنا ہے
جہاں پہ مہر و مہ و کہکشاں اُترتے ہیں

نگاہِ شوق نے خوابوں میں جن کو دیکھا ہے
بیاضِ دل سے وہ منظر کہاں اُترتے ہیں

اگر خیال میں شامل ہو تیرے ذکر کا نم
ورق ورق پہ کئی گلستاں اُترتے ہیں

خدا کا شکر ہے کہ نسبت ہے اُس دیار کے ساتھ
پئے سلام ملائک جہاں اُترتے ہیں

انساں کو ذلت سے نکالا تُو نے
ظلمات کو بخشا ہے اجالا تُو نے

اصنام پرستوں کو سکھا کر توحید
اندھوں کو کیا دیکھنے والا تُو نے

محیطِ عالمِ امکاں ہُوا جمالِ صبا
کھُلی ہوئی ہے زمیں پر کتابِ موسمِ گل



غزلیات

خاکِ خموش کو کبھی ولولۂ نمو بھی دے
باغ خزاں گزیدہ کو لذتِ رنگ و بُو بھی دے

تشنگیِ وجودِ گِل، وقفِ سراب تا بہ کے؟
اے مرے بحر آفریں! جام بھی دے، سبو بھی دے

شامِ فراق کو کہیں غیرتِ صبح وصل کر
کُنجِ اسیرِ عشق کو شوکتِ کاخ و کُو بھی دے

گرچہ ہے وجۂ سوز و ساز خلوتِ بے صدا یہاں
ہاں مگر اے زمانہ گیر! جلوتِ ہاؤ ہو بھی دے

لوحِ زوال پر کوئی نقشِ بقا بھی ثبت ہو
موت سے ہم کنار کر، جینے کی آرزو بھی دے

عرصۂ وہم میں کہیں حرفِ یقیں چمک اُٹھے
میرے کسی سوال کا کوئی جواب تُو بھی دے

نہ ماہِ چار دہم میں نہ آفتاب میں ہے
وہ روشنی جو مرے حُسنِ انتخاب میں ہے

تمام عمر رہی ہے مجھے تلاش اُس کی
وہ ایک عکسِ گریزاں جو میرے خواب میں ہے

زمینِ وہم سے نخلِ یقین پھُوٹتا ہے
نشانِ موجۂ آبِ رواں سراب میں ہے

کوئی تو ہے جو مرے حرف میں چمکتا ہے
کوئی تو ہے جو مرے فکر کی کتاب میں ہے

قبائے گل سے جُدا کر دیا ہے خوش بُو کو
نسیمِ صبحِ چمن ، عرصۂ عذاب میں ہے

خُدا کرے کہ مری روح میں اُتر آئے
وہ سیلِ درد کہ جو عشق کے نصاب میں ہے

کوئی اشارہ ، کوئی التفات ، کوئی کرم
کہ میرے ساتھ زمانہ بھی اضطراب میں ہے

میں خاک چھانتا ہوں، آفتاب دیکھتا ہوں
حریمِ دشت میں خوش بُو کے خواب دیکھتا ہوں

حصارِ غیر میں رہتا ہے یہ مکانِ وجود
میں خلوتوں میں بھی اکثر عذاب دیکھتا ہوں

یہ اور بات کہ باقی ہے تشنگی دل کی
میں تجھ کو دیکھتا ہوں اور بے حساب دیکھتا ہوں

یہ کیا کہ عہدِ بہاراں میں ہر شجر بے برگ
یہ کیا کہ فصلِ خزاں میں گلاب دیکھتا ہوں

مرے خیال میں کھلنے لگے ہیں زخمِ فراق
تمھارے لطف و کرم کا حساب دیکھتا ہوں

ورق ورق پہ ترے خال و خد ہیں عکس فگن
ہجومِ یاس میں دل کی کتاب دیکھتا ہوں

یہ بے سبب تو نہیں گردِ رہ گزر ناشاد
تلاشِ آبِ رواں میں سراب دیکھتا ہوں

نئے موسم کی بشارت ہیں ہم
بزمِ امکان کی زینت ہیں ہم

ہم سے کیا آنکھ ملائیں مہ و مہر
ذرۂ خاک کی عظمت ہیں ہم

ہم سے سیراب ہوا قریۂ حُسن
چشمِ بے تاب کی فطرت ہیں ہم

اپنا کیا ہے کہ رہے یا نہ رہے
ہاں! مگر تیری ضرورت ہیں ہم

ہم کو سرگرمِ سفر رہنا ہے
موجۂ آب کی صورت میں ہم

دسترس میں ہے جہانِ صحرا
اہلِ دل ، اہلِ محبت میں ہم

دھیان میں رہتا ہے وہ مصحفِ گل
ہر گھڑی محوِ عبادت میں ہم

وہ سیلِ نور جدھر سے گزرتا جاتا ہے
رخِ حیات کا منظر نکھرتا جاتا ہے

کبھی بہار کی صورت مرے چمن میں آ
خیال و خواب کا موسم بکھرتا جاتا ہے

جو کل تلک مری قربت کے خواب بُنتا تھا
وہ شخص اب مجھے پامال کرتا جاتا ہے

میں جب بھی تجھ کو بُھلانے کا عزم کرتا ہوں
جبینِ دل پہ ترا عکس اُبھرتا جاتا ہے

بساطِ مہر و محبت لپیٹ دی جائے

دلوں میں زہرِ عداوت اُترتا جاتا ہے

مری حیات کے بے رنگ و نور خاکے میں

ترا خیال عجب رنگ بھرتا جاتا ہے

عجیب عرصۂ اوہام ہے کہ اب ناشاد

یہ قلبِ سادہ و خوش فہم ڈرتا جاتا ہے

طَلَبِ غیر میں جو خود کو بُھلائے ہوئے ہیں
جانے کس خاک سے وہ لوگ اُٹھائے ہوئے ہیں

اب رہائی تجُھے ہم سے نہیں ملنے والی
زندگی! تُو نے بہت زخم لگائے ہوئے ہیں

اِن پہ اب رنجِ سفر کھینچنا ہو گا تم کو
یہ تو وہ رستے ہیں جو تیرے دکھائے ہوئے ہیں

حاصلِ عشق نہیں کچُھ بھی بہ جز داغِ وفا
ہم یہی بارِ گراں مایہ اُٹھائے ہوئے ہیں

بندشِ ضبط ! ذرا دیر کی مہلت دے دے
اشک اب آنکھ کی دہلیز تک آئے ہوئے ہیں

جن کے ذرّوں کو بھی سورج کا سلام آتا ہے
ہم انھی راہ گزاروں کے ستائے ہوئے ہیں

ہوسِ راحت و عشرت نہیں کھینچی ہم نے
ہاں ترا درد ، کہ سینے سے لگائے ہوئے ہیں

ہوا نے کب اُسے رکنے دیا ہے
خدا ٹہنی سے جو پتّا ہوا ہے

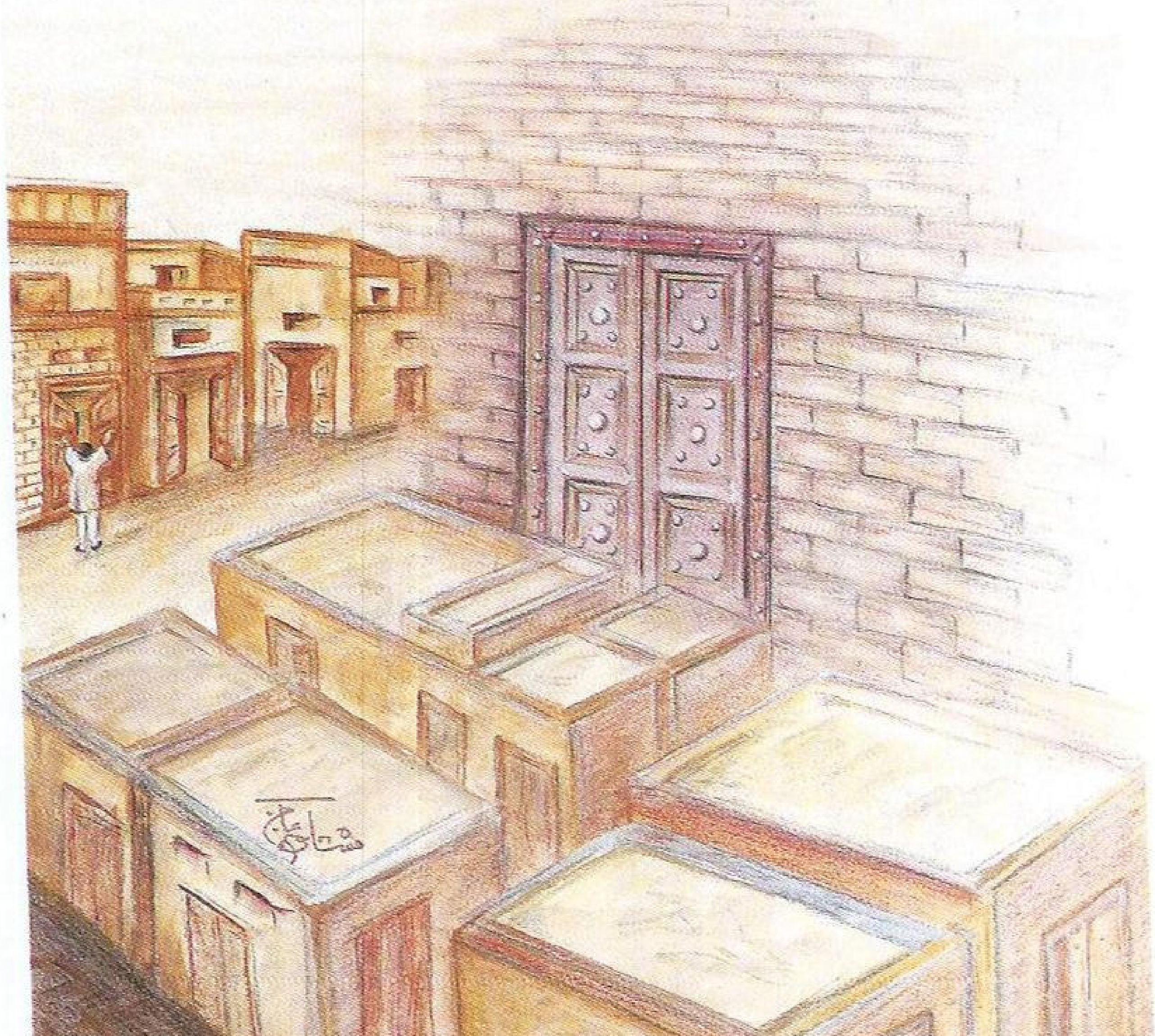
تلاشِ لامکاں میں اُڑ رہا ہوں
مگر مجھ سے مکاں لپٹا ہوا ہے

خُدا کی دسترس میں تھے سمندر
مگر اُس نے مجھے صحرا دیا ہے

لبوں پر تشنگی ہے دشت صورت
اور آنکھوں میں سمندر ناچتا ہے

پتا ناشاد نیلے پانیوں کا
مسافر کو سرابوں سے مِلا ہے

وہ ایک در کہ بہت ناز تھا مجھے جس پر
پھر اُس کے بعد بہت دیر در بہ در ہوا میں



دل کو کسی گمان میں رکھا نہیں کبھی
تیرِ ستم کمان میں رکھا نہیں کبھی

شوقِ نمو کو ہم نے بکھرنے نہیں دیا
خوفِ زوالِ اُڑان میں رکھا نہیں کبھی

خود کو قتیلِ فتنۂ ہجراں سمجھ لیا
تجھ کو تو امتحان میں رکھا نہیں کبھی

صحرا کو تیرے ذکر سے سرشار کر دیا
خوش بُو کو گلستان میں رکھا نہیں کبھی

تیرا خیال نقشِ تمنّا بنا رہا
دُنیا کو ہم نے دھیان میں رکھا نہیں کبھی

پھرتے رہے تلاشِ محبت میں کُو بہ کُو
خود کو کسی مکان میں رکھا نہیں کبھی

حرفِ دعائے وصل کو جو معتبر کرے
وہ ذائقہ زبان میں رکھا نہیں کبھی

سر پہ ہُما کا سایا بھی نہیں رہتا سائیں
سدا چمکتا ستارا بھی نہیں رہتا سائیں

چاند کے گھٹنے کا منظر دل میں سمایا تھا
اب تو کبھی یہ پُورا بھی نہیں رہتا سائیں

جیسے حرف صحیفوں کے میلے پڑ جائیں
چاہ کا ورد وظیفہ بھی نہیں رہتا سائیں

پاؤں کے چکر بھی تھم جاتے ہیں آخر
مٹی کا یہ سودا بھی نہیں رہتا سائیں

ہر اک آہٹ پر کیوں بے چینی لہرائے
دل میں کوئی کھٹکا بھی نہیں رہتا سائیں

سہما سہما رہتا ہے پانی دریا کا
لشکر اب تو پیاسا بھی نہیں سائیں

کاغذ اور خامہ سے کیا رشتہ رکھیں ہم
لفظ اگر تابندہ بھی نہیں رہتا سائیں

ہم جنوں پیشہ کہ رہتے تھے تری ذات میں گم
ہو گئے سلسلۂ گردشِ حالات میں گم

عرصۂ وصل میں بھی حرفِ تمنا نہ کھلا
حسنِ الہام رہا پردۂ آیات میں گم

عقل انگشت بہ دنداں ہے نظر حیراں ہے
کون سی چیز ہوئی ارض و سماوات میں گم

کتنے کنعان ہوئے خوابِ زلیخا میں اسیر
کتنے یعقوب رہے ہجر کے صدمات میں گُم

کوئی مائل بہ سماعت نہ ہوا صد افسوس!
نغمۂ درد رہا سینۂ جذبات میں گُم

میں ترے شہر سے گُزرا ہوں بگولے کی طرح
اپنی دنیا میں مگن، اپنے خیالات میں گُم

آنکھ آسودۂ جمال کہاں
جلوۂ ماہِ بے مثال کہاں

زندگی کرب میں گُزرتی ہے
لب کو ہے تابِ عرضِ حال کہاں

جو تری زلف کا ہے سایہ نشیں
اُس کو اندیشۂ زوال کہاں

ہم پہ وا ہے درِ جہانِ فراق
خواہشِ لذتِ وصال کہاں

عرصۂ گفت گو میں خاموشی
تُو کہاں ہے؟ ترا خیال کہاں؟

میں کہ اپنی تلاش میں گُم ہوں
جاگ اُٹھا ترا سوال، کہاں

کبھی حریمِ گلستاں کے سنگ ہے خوش بُو
کبھی سوادِ بیاباں کا رنگ ہے خوش بُو

کبھی ہوائے خزاں کے جلو میں رقصاں ہے
کبھی بہار رُتوں کی ترنگ ہے خوش بُو

کبھی نوائے فراقِ الم نظر آئے
کبھی وصالِ طرب کی اُمنگ ہے خوش بُو

کبھی پیامِ محبت کلی کلی کو دے
کبھی گلاب سے مصروفِ جنگ ہے خوش بُو

کبھی کشاکشِ دنیا کے در پئے آزار
کبھی سکوتِ زمانہ سے تنگ ہے خوش بُو

کبھی ازل کی طرح لوحِ سادہ و بے رنگ
کبھی ابد کی طرح رنگ رنگ ہے خوش بُو

روش روش پہ رُخ اپنا بدل رہی ہے صبا
قدم قدم نئے سانچے میں ڈھل رہی ہے صبا

عجیب موسمِ اوہام ہے کہ سوچتے ہیں
حدودِ گُل بدناں سے نکل رہی ہے صبا

کہیں بساطِ غرورِ چمن اُلٹ ہی نہ دے
کہ شاطروں کی طرح چال چل رہی ہے صبا

پناہِ دامنِ بادِ خزاں ، سکونِ وجود
غمِ بہارِ ازل سے سنبھل رہی ہے صبا

سُنا کے طائرِ بے پر کو مژدۂ ہجرت
شجر شجر سے لپٹ کر مچل رہی ہے صبا

یہ سب نقوش و مناظر طلسمِ خواب و خیال
اُتر کے باغ میں ہاتھ اپنے مَل رہی ہے صبا

نظر میں ٹھہرا تھا پل بھر جو خوابِ موسمِ گُل
چکا رہے ہیں ابھی تک حسابِ موسمِ گُل

محیطِ عالمِ امکاں ہوا جمالِ صبا
کُھلی ہوئی ہے زمیں پر کتابِ موسمِ گُل

بس اِک جھلک، کہ دلِ بے قرار کو کب سے
ستا رہی ہے بہت آب و تابِ موسمِ گُل

تمام عمر رہا دھیان میں وہ مصحفِ نور
کشید کرتے رہے ہیں شرابِ موسمِ گُل

گُلِ مراد ، صبائے گریز پا اور تُو
نہیں کچھ اس سے زیادہ شبابِ موسمِ گُل

کِھلا نہ پھُول کوئی شاخِ آرزو پہ کبھی
نظر میں جب سے بسایا ہے خوابِ موسمِ گُل

یہ راحتوں کی تمنّا ہے بے اثر ناشاد
علاجِ کم نگہی ہے عذابِ موسمِ گُل

ازل سے جو شریکِ درد و غم تھا وہ مقدر ڈھونڈتا ہوں
کسی تاریک پس منظر میں رہ کر پیش منظر ڈھونڈتا ہوں

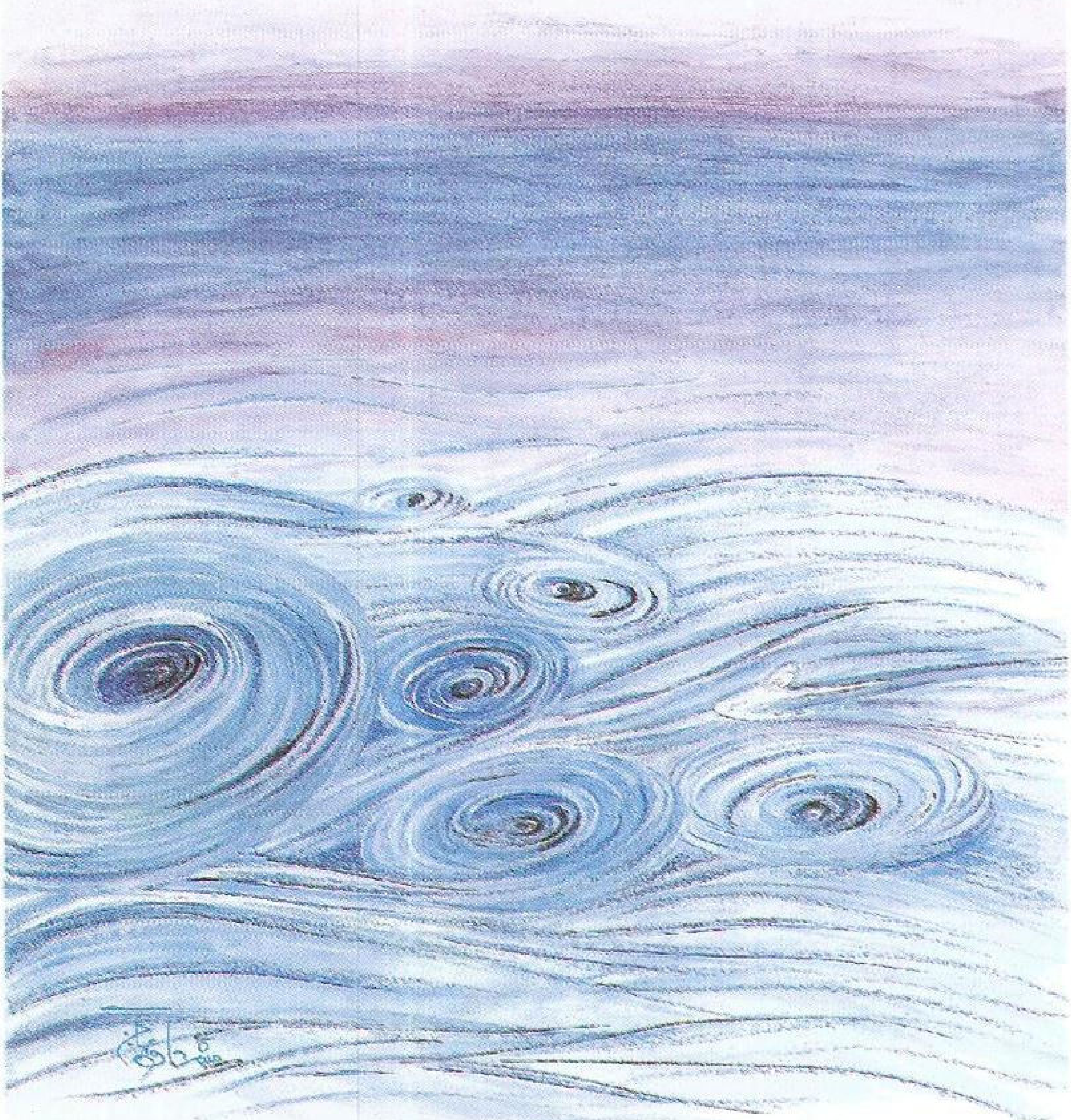
کبھی آغوشِ مشرق کو عطا کرتا ہوں میں خورشیدِ رفتہ
کبھی پیشانیِ مغرب کی تاریکی میں خاور ڈھونڈتا ہوں

فلک کے پار اُڑنے کا جنوں سینے میں پھر رچ بس گیا ہے
نشیبِ ارض میں اپنے وہی مدفون شہ پَر ڈھونڈتا ہوں

مرے مولاؐ! مری آنکھوں کو سارے بھیگتے موسم عطا کر
بہت مدت سے میں صحرا کے سینے میں سمندر ڈھونڈتا ہوں

مری پہچان کے سب موسموں کے رنگ تھے ناشاد، جس سے
اب اپنی ذات کے ویراں جزیروں میں وہ جوہر ڈھونڈتا ہوں

ایک طوفانِ بلاخیز رہا چاروں اور
عرصۂ عمر میں نادیدۂ ساحل رہے ہم



کم دامانی کو جب کوئی اشارہ مل جاتا ہے
دریاؤں میں پھر بحرِ بے پروا مل جاتا ہے

عزمِ سفر سے مٹ جاتے ہیں دیواروں کے نقش
خوشبوؤں کو جیسے ہر سُو رستہ مل جاتا ہے

جس کی وحشت کھونی مشکل ہو جاتی ہے پیارے!
ایسے آہوئے رم خوردہ کو صحرا مل جاتا ہے

اُس کی یادیں تنہائی میں ہم سے کلام کریں
ہم سے جیسے کوئی ہم سا تنہا مل جاتا ہے

ویرانوں میں اُس کے آجانے سے پھُول کِھلیں
تشنۂ دید کو گویا اذنِ تماشا مل جاتا ہے

پا بہ سفر ہیں اُس کی تلاش میں صدیوں سے ناشاد
ڈھونڈنے والوں کو جانے یاں کیا کیا مل جاتا ہے

عشق کی آرزو خوش بُو

حُسن کی آبرو خوش بُو

چاک ہے گر قبائے گُل

کر رہی ہے رفو خوش بُو

ہاتھ میں آگئے آخر

جام خوش بو ، سبو خوش بُو

کس نے بھڑکا دیا کہ ہوئی

رنگ سے دو بہ دو خوش بُو

آخرِش ہم جُدا ہوں گے
میں ہوں اِک پھُول تو خوش بُو

پھُول پامالِ دہر ہوا
ہوگئی سرخ رُو خوش بُو

قریۂ خواب میں ناشاد
لہجۂ گفت گُو خوش بُو

وہ عشق کہ حاصلِ زیست بنے پابندِ دلیل نہیں ہوتا
جس شہر نے بسنا ہوتا ہے مرہونِ فصیل نہیں ہوتا

یہ قلب و نگاہ کے قصے ہیں، یہ رنگ و بُو کا بھید میاں
آتش گل زار نہیں بنتی ، ہر شخص خلیل نہیں ہوتا

یہ وہم و گماں کی فصل نہیں، یہ راز و نیاز کی دنیا ہے
ہر درد نصاب نہیں بنتا ، ہر غم قندیل نہیں ہوتا

یہ رستہ عشق کا رستہ ہے یاں سوزِ دروں ہی خضر بنے
یاں سمتِ سفر کا ذکر کہاں، یاں سنگِ میل نہیں ہوتا

وہ دل کی حریم میں بس جائے یا آنکھ کا محور ہو جائے
جو نقشِ دوام کا حامل ہو، موسم تبدیل نہیں ہوتا

ناقدریِ دوراں کا قصہ اب کس کو سناؤ گے ناشاد
یاں کس کے سر پر پگڑی ہے، یاں کون ذلیل نہیں ہوتا

درد کا نقش بنا ، کرب کی تصویر ہوا
میں جنوں کیشِ ازل ، کُشتۂ تقدیر ہوا

مُجھ کو مسمار نہ کر عرصۂ نادانی میں
میں زمانوں کی ریاضت سے ہوں تعمیر ہوا

زخم کیا زخم کہ جو چارہ گری کو ترسے
خواب کیا خواب جو منت کشِ تعبیر ہوا

کیوں بُلاتا ہے چمن زار مجھے اپنی طرف
اب تو ویرانہ مرے پاؤں کی زنجیر ہوا

ہاتھ آتی نہیں اب کوئی یقیں کی صورت
بے خیالی میں عجب وہم بغل گیر ہوا

مجھ کو جو درد بھی چھُو جائے وہ راحت ہو جائے
آتشِ ہجر کی لذت سے میں اکسیر ہوا

کوئی پیرایۂ اظہار ملے اُس کو بھی
ورقِ دل پہ جو افسانہ کہ تحریر ہوا

وہ اگر گرمِ تماشا ہو جائے
سینۂ دہر میں کیا کیا ہو جائے

کون جھیلے گا وہ طغیانیِ ظرف
ذرۂ خشک جو صحرا ہو جائے

اُس کی آنکھوں میں کہاں خواب اُتریں
چاند بھی جس کا شناسا ہو جائے

اس کا افسانۂ دل کون سُنے ؟
جو ترے شہر میں رُسوا ہو جائے

(ق)

تُو بھی ہو جائے خراباتِ نشیں
تُجھ کو بھی عشق کا سودا ہو جائے

تُجھ پہ بھی ہجر کے اسرار کھُلیں
کاش! تُو بھی کبھی تنہا ہو جائے

تھی جن سے نگاہ میں تابانی ، پامال وہ نقش و نگار ہوئے
اے عمرِ عذاب شناس بتا، کس خواب میں ہم بیدار ہوئے

وہ ماہِ خرام آمادہ کب بادل کے حصار میں ٹھہرا تھا؟
کیوں گہری جھیلوں کے پانی اب اُس کے لیے دیوار ہوئے

اُڑنے کی طلب میں خاک ہوئے، جو اسیرِ خیال و خواب رہے
جنھیں خاک نے اِذنِ کلام دیا، وہ لوگ زمیں کا وقار ہوئے

اِک حرف یقیں کی خوش بُو نے سرشار کیا ہے مکانِ وجود
اِک عکسِ لطیف کی برکت سے صحرائے جہاں گُل زار ہوئے

وہ لوگ کہاں جو نسلوں کا دکھ درد اُٹھاتے تھے ناشاد
ہم اپنی ذات کا بوجھ بنے ، ہم اپنے وجود کا بار ہوئے

گئے زمانے کو ہم حال سے ملاتے رہے
کبھی کسی کو کبھی خود کو آزماتے رہے

تلاشِ عکسِ گریزاں میں بارہا یہ ہوا
میانِ گردِ جنوں خود کو بھول جاتے رہے

یہ اور بات کہ ٹوٹا نہ کہنگی کا طلسم
زمانے والے تو منظر نئے بناتے رہے

ردائے خواب میں لپٹے رہے زمان و مکاں
وصال و ہجر نئی بستیاں بساتے رہے

رہینِ جورِ تلاطم رہا سفینۂ زیست
تمام عمر سفر کے عذاب اُٹھاتے رہے

آرزو ہے کہ ساری دنیائیں
ذرۂ خاک میں سمٹ آئیں

جھیلنا ہے اگر عذابِ فراق
وصل کا گیت کس لیے گائیں

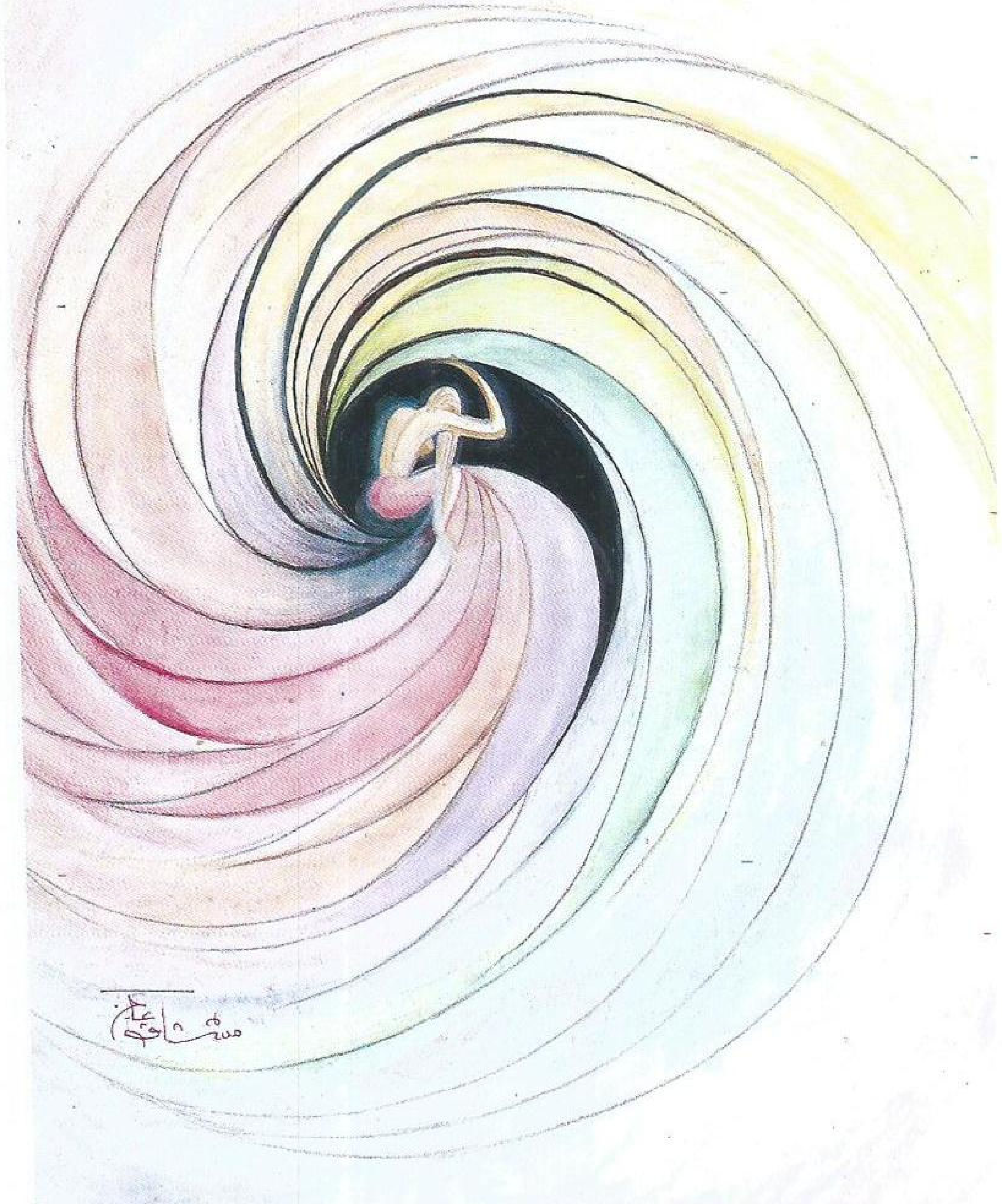
زندگی کچھ نہیں بہ جُز اس کے
پھول جیسے بکھر بکھر جائیں

جن سے قائم ہے اعتبارِ جمال
کاش! وہ لوگ بھی نظر آئیں

بڑھ رہی ہے شگفتگی دل کی
کیا کریں اور کس طرف جائیں ؟

واہموں کے جہان میں ناشاد
ہم کہاں سے یقین کو لائیں

تمام عمر رہی ہے مجھے تلاش اُس کی
وہ ایک عکسِ گریزاں جو میرے خواب میں ہے -



شورشِ دہر میں رہے ، عرصۂ جنگ میں رہے
کش مکشِ وجود کے دامِ ترنگ* میں رہے

بزمِ معاملات کے رنگ بکھر بکھر گئے
فطرتِ خاک بن کے ہم پہلوۓ سنگ میں رہے

اِس دلِ کم مراد نے مشقِ عذاب کر دیا
نقشِ بدف بنے رہے ، چشمِ خدنگ میں رہے

منزلِ خواب کا نشاں گرچہ گریز پا رہا
گردِ سفر لپیٹ کر سحرِ اُمنگ* میں رہے

اپنے وجودِ اصل کو خود سے علاحدہ رکھا
نغمۂ خام کی طرح لحجۂ چنگ میں رہے

* اساتذۂ سخن سے معذرت کے ساتھ

نغمۂ درد ترے سوز میں شامل رہے ہم
للہ الحمد کہ آسودۂ منزل رہے ہم

بے خیالی میں بھی یہ دھیان بہ ہر طور رکھا
ایک لمحہ نہ ترے ذکر سے غافل رہے ہم

ناتوانی میں بھی اِک کوہِ گراں کی صورت
گردشِ دہر! ترے مدِ مقابل رہے ہم

پشت پر دستِ دعا کس کا رہا ہے ضَو ریز
تیرہ و تار شبوں میں مہِ کامل رہے ہم

ایک طوفانِ بلاخیز رہا چاروں اُور
عرصۂ عمر میں نادیدۂ ساحل رہے ہم

مچل رہے ہیں بہت ارضِ بے نمو کے داغ
کبھی تو اے گُلِ تازہ نکھار دل کا باغ

وہ زندگی جو کبھی عرصۂ جنوں میں تھی
دیارِ ہوش و خرد میں ملا نہ اُس کا سراغ

درونِ ذات کی تاریکیاں نہیں چھٹتیں
فصیلِ دل پہ جلا کر رکھا ہوا ہے چراغ

تُمھارے ذکر سے اب بھی وجود گونجتا ہے
غمِ زمانہ سے ممکن نہیں اگرچہ فراغ

کُھلیں تو کیسے کُھلیں اُن پہ خاک کے اسرار
فرازِ عرش سے لپٹے ہوئے ہیں جن کے دماغ

ازل سے ہے طلبِ عرصۂ بہار ہمیں
زمینِ گُل پہ کسی روز تُو اُتار ہمیں

تمام عمر سفر میں رہے بہ رنگ صبا
جنونِ خواب نے رکھا ہے بے قرار ہمیں

یہ کیا کہ جس نے کبھی لوٹ کر نہیں آنا
رہے گا تا بہ ابد اُس کا انتظار ہمیں

لکھا تھا لوحِ تمنا پہ ہم نے نام اُس کا
بس ایک بار ملا تھا کُچھ اختیار ہمیں

چمن سے بے سبب اُٹھتے نہیں قدم ناشاد
بلا رہا ہے کہیں دشتِ بے کنار ہمیں

محبت کا سفر آغاز کرنا چاہتے ہیں
جہانِ رنگ و بُو کے پار اُترنا چاہتے ہیں

جہاں شہزادگانِ عہدِ رفتہ گُم ہوئے تھے
اسی شہرِ فسوں سے ہم گُزرنا چاہتے ہیں

اجازت دے تُو اے خاکِ کشادہ ظرف ہم کو
ستاروں کا نگر پامال کرنا چاہتے ہیں

کبھی عہدِ خزاں میں تازگی کی آرزو ہے
کبھی فصلِ بہاراں میں بکھرنا چاہتے ہیں

لب و رخسار کے اظہار سے مہلت ملی تو
غزل میں اور بھی کچھ رنگ بھرنا چاہتے ہیں

نگہ میں ، قلب میں، گُل میں، شباب میں خوش بُو
رہی جہاں بھی رہی اضطراب میں خوش بُو

یہ کس کے حُسنِ نظر سے ہے کائنات میں رنگ
یہ کس کا فیض عطا ہے گلاب میں خوش بُو

ورق ورق پہ گلستاں نثار ہوتا ہے
رکھی ہے کس نے یہ دل کی کتاب میں خوش بُو

یہ کس گُداز بدن کی کرشمہ کاری ہے
مچل رہی ہے بہت جوئے آب میں خوش بُو

مہک رہا ہے ابھی تک یہ خاک دانِ وجود
بس ایک بار کہ اُتری تھی خواب میں خوش بُو

یہ خاک بے امان ہو گئی ہے کیا؟
زمین آسمان ہو گئی ہے کیا؟

یہ کنجِ دشت میں گُلاب کِھل اٹھے
صبا بھی مہربان ہو گئی ہے کیا؟

وہ آرزو کہ تھی دلِ وجودِ غم
غبارِ کاروان ہوگئی ہے کیا؟

طلسم ہے کہ خواب ہے کہ اصل ہے؟
میاں ! یہ داستان ہوگئی ہے کیا؟

مہک اُٹھا ہے کس لیے یہ زخمِ دل؟
بہار پھر جوان ہو گئی ہے کیا؟

آنکھ نم ناک رہی دل کی پریشانی سے
آتشِ عشق بُجھی ہے نہ مگر پانی سے

عرصۂ وصل میں دل اپنا بہلتا ہی نہیں
ایسے مانوس ہوئے ہجر کی تابانی سے

ہم کہ ٹھہرے ہیں جنوں پیشہ و آزار طلب
لطف اُٹھاتے ہیں بہت دشت کی ویرانی سے

جس نے چھینی تھی مری صبحِ بقا کی تنویر
ظلمتیں چاٹ رہا ہے وہ پشیمانی سے

ہم سوئے منزلِ مقصود رواں تھے ناشاد
راستے دیکھ رہے تھے ہمیں حیرانی سے

تلاشِ لامکاں میں اڑ رہا ہوں
مگر مجھ سے مکاں لپٹا ہوا ہے



شمیمِ نکہت افزائے جہاں رہنا پڑے گا
اسی خاکِ چمن کا رازداں رہنا پڑے گا

سفر لکھا گیا ہے اور کہیں رُکنا نہیں ہے
بہ شکلِ موجۂ آبِ رواں رہنا پڑے گا

کہانی کے مسافر شاہ زادے کی طرح اب
طلسماتِ انا میں جاوداں رہنا پڑے گا

حرائے جاں میں جب تک تیرگی باقی رہے گی
دلِ ہجر آشنا کو ضَو فشاں رہنا پڑے گا

نہ جب تک موسمِ ظلِ ہُما ناشاد اُترے
اسیرِ گردشِ سیارگاں رہنا پڑے گا

غضب ہے اجنبی لگتے نہیں ہیں
وہ چہرے جو کبھی دیکھے نہیں ہیں

فسونِ تشنگی باقی رہے گا
ابھی ہم ٹُوٹ کر برسے نہیں ہیں

دیارِ خواب میں دیکھا ہے جن کو
وہ منظر آنکھ میں اُترتے نہیں ہیں

وہی آثار ہیں شہرِ جنوں کے
زمانے کی طرح بدلے نہیں ہیں

عبث ہے دعویٰ درد آشنائی
ابھی تو زخم بھی گہرے نہیں ہیں

دل اُس ویراں حویلی کی طرح ہے
کہ جس کے در کبھی کُھلتے نہیں ہیں

فلک سے دوستی کی آرزو ہے
زمیں کے راز کو سمجھے نہیں ہیں

تمھارے وصل کے گُل پوش موسم
دلِ بے نور میں ٹھہرے نہیں ہیں

ترے خیال کو دل میں اُتارنا ہے کبھی
خزاں نصیب چمن کو سنوارنا ہے کبھی

وہ نقش جس کو تصور کی آنکھ دیکھتی ہے
کتابِ دل کے ورق پر اُبھارنا ہے کبھی

بھُلا دیا ہے زمین و زمانہ جس کے لیے
رہِ جنوں میں اُسے بھی پکارنا ہے کبھی

وہ دل کہ نشۂ پندار میں ہے جو سرشار
ترے دیار سے اُس کو گُزارنا ہے کبھی

سجا کے دشتِ تمنا میں تیری یاد کے پھُول
فضائے قلب و نظر کو نِکھارنا ہے کبھی

ہمارے بخت کے سب زاویے کمال کے ہیں
کہ ہم اسیر ازل سے ترے جمال کے ہیں

ہماری آنکھ میں جچتا نہیں کوئی منظر
گلِ مراد! کرشمے ترے خیال کے ہیں

زمانہ جن کو سمجھتا رہا ہے نقشِ بقا
یہ اب کُھلا ہے کہ سب مرحلے زوال کے ہیں

ترے فراق میں جاں سے گُزر نہ جائیں کہیں
کہ اب فراق کے لمحے بھی ماہ و سال کے ہیں

خزاں کی رت میں بھی شاداب ہے زمینِ دل
کرم جو ہم پہ ہیں سب بادِ خوش خصال کے ہیں

ازل سے تیری طلب نے سفر میں رکھا ہوا
وگرنہ کیا ہے یہاں رہ گزر میں رکھا ہوا

جہاں ملے تھے زمانے وصال و ہجراں کے
ابھی تلک ہے وہ منظر نظر میں رکھا ہوا

جسے زوال نہیں ہے بیاضِ امکاں میں
وہ لفظ ہے مرے دستِ ہنر میں رکھا ہوا

کہیں قیام نہیں ہے جہانِ حیرت میں
عجب سفر ہے مرے بال و پر میں رکھا ہوا

دیارِ ہجر میں کُچھ بھی نہیں ہے پاس اپنے
مگر وہ عکس کہ ہے چشمِ تر میں رکھا ہوا

ہر چند رہا سیلِ تمنا سے ہم آغوش
لیکن کہ کبھی کم نہ ہوئی تشنگیِ دل

اُس کے راز کو چاند نہ سمجھے ، بھید نہ تارا پائے یہاں
وہ جو اپنے اُجلے من سے چمک اشارا پائے یہاں

اُس کی گود میں کیا کیا خوش بُوئیں رَم کرتی ، لہراتی ہیں
رنگ کو جو پوشاک بنائے روپ نیارا پائے یہاں

اپنی نگاہ کی دنیا ایسی جس کا انت نہ موڑ کوئی
گُن والا ہی بحرِ بسیط کا ڈھونڈ کنارا پائے یہاں

بے توقیروں کی بستی میں اپنا سایہ بھی دشمن ہے
بختِ ہما پایا ہے اُس نے وہ جو سہارا پائے یہاں

اب کے موسم ویرانی کی زد میں ہے لیکن ناشاد
دل ناداں بر منظر نِکھرا نِکھرا، پیارا پائے یہاں

کون ہے واقفِ کتابِ دل

کس پہ وا ہو رہا ہے بابِ دل

گھٹ رہی ہے فراق کی لذت

بڑھ رہا ہے کچھ اضطرابِ دل

حیرتی ہے جہانِ عقل و نگاہ

مرحبا! حسنِ انتخابِ دل

جانے کب تک رہے گا بے تعبیر

آنکھ میں تیرتا ہے خوابِ دل

اے کہ تو باعثِ دل آزاری
اے کہ تو چارۂ عذابِ دل

چشمِ عالم سرشک افشاں ہے
کُھل رہی ہے کہیں کتابِ دل

ہے وہی واقفِ رموزِ جنوں
جس کو معلوم ہے نصابِ دل

خیال و خواب میں شامل ہوئے جمال کے رنگ
کتابِ دل میں اُترنے لگے کمال کے رنگ

نگاہِ شوق بہاروں پہ طنز کرتی ہے
جنوں نواز ہوئے عرصۂ زوال کے رنگ

تمھاری یاد بھی کیا معجزے دکھانے لگی
شبِ فراق پہ نازاں ہوئے وصال کے رنگ

وہی دیارِ محبت میں سرخ رُو ٹھہرا
کھُلے ہیں جس پہ تری چشمِ خوش خصال کے رنگ

بہار! تُو نے بہت انتظار میں رکھا
خزاں کی نذر ہوئے میرے ماہ و سال کے رنگ

اُسی کے فیض سے میرا ہُنر چمکتا ہے
مری غزل میں ہیں جس حُسنِ بے مثال کے رنگ

عذابِ شام و سحر کا شمار کرتے ہوئے
گزر رہی ہے ترا انتظار کرتے ہوئے

کبھی تو خیمۂ جاں سے گزر بہ رنگِ صبا
فضائے قلب و نظر کو بہار کرتے ہوئے

بسا ہوا تھا کوئی خواب چشمِ حیرت میں
محبتوں کا سفر اختیار کرتے ہوئے

وہ بات، جانتے تھے کب سے تیرے شہر کے لوگ
میں ڈر رہا تھا جسے آشکار کرتے ہوئے

یہ دل تو کیا ہے، اگر دو جہاں بھی ہاتھ لگیں
ذرا بھی غم نہ ہو، تجھ پر نثار کرتے ہوئے

دیارِ ہجر سے پھر آج اُس کی یاد کا سیل
گزر گیا ہے ہمیں اشک بار کرتے ہوئے

خاک پر تھا نہ آسمان میں تھا
وہ جو اِک نقش میرے دھیان میں تھا

منزلِ وصل سامنے تھی مگر
عرصۂ ہجر درمیان میں تھا

اِک تری یاد تھی کہ ساتھ رہی
ورنہ کچھ بھی نہ اس جہان میں تھا

آج وہ شاملِ یقین ہوا
کل تلک جو مرے گمان میں تھا

باغ تو کیا، بہشت میں بھی نہیں
لطف، جو میرے خاک دان میں تھا

اِک زمانہ تھا گوش بر آواز
جانے کیا سحر داستان میں تھا

تری طلب میں ستاروں کا ہم سفر ہوا میں
خدا کا شکر کہ اس درجہ معتبر ہوا میں

میانِ خلق ازل سے رہا ہوں ریزۂ سنگ
تری جبیں پہ جو چمکا تو پھر گہر ہوا میں

وہ ایک در کہ بہت ناز تھا مجھے جس پر
پھر اُس کے بعد بہت دیر در بہ در ہوا میں

میں مشتِ خاک کی صورت ہوا کی زد میں تھا
بہ فیضِ کوزہ گراں نقشِ معتبر ہوا میں

مرے ہُنر سے ہوا مستنیر جس کا بخت
یہ کیا کہ اس کی نظر میں بھی بے ہُنر ہوا میں

حریمِ جاں کو محبت کی بارگاہ کیا
دلِ غریب و زوال آشنا کو شاہ کیا

رہی مثال زمانے میں تمکنت اُس کی
وہ خوش جمال جسے تُو نے کج کُلاہ کیا

مقامِ شکر کہ ٹھہرا وہی نصابِ عشق
جنوں میں ہم نے جو دل کا ورق سیاہ کیا

کبھی وصالِ طرب سے لڑی نہ آنکھ اپنی
تمام عمر غمِ ہجر سے نباہ کیا

ہوا نہ کارِ محبت کوئی بہ جُز اس کے
تُمھارا ذکر کیا اور بے پناہ کیا

قبائے گل سے جُدا کر دیا ہے خوش بُو کو
نسیمِ صبحِ ازل نے عجب گناہ کیا

تُمھارے ذکر کو بُوئے سمن سمجھتے ہیں
دلِ حزیں کو وفا کا چمن سمجھتے ہیں

ہماری خاک میں شامل نہیں ہے سرتابی
وگرنہ ہم بھی رموزِ سخن سمجھتے ہیں

بہار ، پھُول کِھلاتی ہوئی بہار کو ہم
تُمھارا اُترا ہوا پیرہن سمجھتے ہیں

یہ دشت جس سے بہت دُور بھاگتے ہیں لوگ
بہ فیضِ عشق اسے ہم، وطن سمجھتے ہیں

اُٹھائے پھرتے ہیں یہ زندگی کا بوجھ مگر
نہ کوئی چال نہ کوئی چلن سمجھتے ہیں

لفظ کو پھُول ، تخیّل کو ستارا کرتے
تب کہیں تذکرۂ وصفِ دل آرا کرتے

سینۂ شوق میں اُبھری ہے تمنائے وصال
تابہ کے؟ شدتِ ہجراں کو گوارا کرتے

کاسۂ ذہن میں بھر جاتا اگر اُس کا جمال
بزمِ امکاں کی صبحوں کو سنوارا کرتے

جس کی خوشبو سے مہکتا ہے یہ ویرانۂ دل
ہم بہ جُز اُس کے بھلا کس کو پکارا کرتے

گر ہمیں کش مکشِ دہر سے رخصت ہوتی
مصحفِ دل پہ ترا نقش اُبھارا کرتے

زمیں بدلنے لگی آسماں بدلنے لگا
ترے بدلنے سے سارا جہاں بدلنے لگا

ہم تُجھے دھیان میں بساتے ہیں
باغ کو آئنہ دکھاتے ہیں

جب صبا تذکرہ کرے تیرا
آنکھ میں خواب جھلملاتے ہیں

ساتھ چلتا نہیں کوئی دو گام
لوگ تو راستہ دکھاتے ہیں

ہم جنوں کیش بے خیالی میں
خاک سے آسماں بناتے ہیں

عرصۂ عمر کاٹنے کے لیے
لوگ کیا کیا عذاب اُٹھاتے ہیں

مکانِ دل کی بنیادیں ہلی ہیں
تمنائیں سراسیمہ کھڑی ہیں

دیے کو لَو مسلسل بڑھ رہی ہے
ہوائیں لڑتے لڑتے تھک گئی ہیں

ابھی شوقِ سفر باقی ہے ہم میں
مگر پاؤں میں زنجیریں پڑی ہیں

زباں پر تذکرے میں روشنی کے
دلوں میں ظلمتیں بڑھنے لگی ہیں

پرانی پگڑیاں پیروں تلے ہیں
نئی نسلیں بغاوت کر رہی ہیں

شجر بے پیرہن ہونے لگے ہیں
بہاریں خونِ تازہ مانگتی ہیں

شوق کی وارفتگی حد سے سوا ہونے لگی
زندگی اپنی دُکھوں کا سلسلہ ہونے لگی

اس قدر احساس پر میرے وہ غالب آگیا
اُس کی ہستی میری ہستی کا پتا ہونے لگی

آنکھ کی واماندگی نے پیرہن بدلے کئی
بے خیالی موسموں کا آئنہ ہونے لگی

میرا سر کٹ کر مرے قدموں کے اوپر ہی گرا
میری ناکامی مری فتحِ انا ہونے لگی

میں در و دیوار کے زِنداں سے باہر آ گیا
ریگِ صحرا کی کشش زنجیر پا ہونے لگی

مہیب شب میں اُجالوں کے دوش پر ہوتے
تُمھاری یاد کے جگنو جو ہم سفر ہوتے

نہ مال و زر نہ زمین و زمانہ چاہیے ہے
دیارِ خاک میں بس اِک ٹھکانہ چاہیے ہے

نہ اس کی عشوہ طرازی کا ذکر چھیڑ اے دل!
اُسے تو ترکِ وفا کا بہانہ چاہیے ہے

یہ طائرانِ چمن بے سبب نہیں اُڑتے
پئے حیات انھیں آب و دانہ چاہیے ہے

کسی کے درد و الم سے غرض نہ راحت سے
ہجومِ خلق کو کوئی فسانہ چاہیے ہے

وہ جس کی یاد میں خود کو بھُلا دیا ہم نے
کبھی کبھی تو اُسے بھی بھُلانا چاہیے ہے

وہ دو گھڑی کی ملاقات میں نہیں کھُلتا
اُسے سمجھنے کی خاطر زمانہ چاہیے ہے

محیطِ عرصۂ امکان ہے کہانیِ ہجر*
ہوا ہے کون شناسائے بے کرانیِ ہجر

خُدا کرے کہ جنوں کو کبھی زوال نہ ہو
وگرنہ کس کو ہے یاں تابِ میزبانیِ ہجر

دیارِ جاں میں بھڑکتا رہا ہے شعلۂ شوق
رہی ہے سایہ فگن ہم پہ مہربانیِ ہجر

عجیب عرصۂ بے گانگی کی زد میں ہیں
کریں تو کس سے کریں شکوۂ گرانیِ ہجر

اسیرِ وصل رہے ہیں خیال و خواب اُن کے
منا رہے ہیں جو اب جشنِ کامرانیِ ہجر

تُمھارا ذکر، کہ اب بھی لبوں کی زینت ہے
ہمارے پاس بچی ہے یہی نشانیِ ہجر*

* اساتذہ سخن سے معذرت کے ساتھ



تعارف نامۂ شاعر

نام : ارشد محمود

قلمی نام : ارشد محمود ناشاد

مولد : ڈومیال تحصیل پنڈی گھیب ضلع اٹک

تاریخِ پیدائش : یکم جنوری ۱۹۷۰ء

تعلیم : پی ایچ ڈی (اُردو)

پیشہ : تدریس

شعبۂ اُردو، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد۔

تصانیف :

☆ آغوشِ گل (شاعری) ۱۹۹۰ء

☆ ابھی تک تُم نہیں سمجھے (غزلیں) ۱۹۹۳ء

☆ اٹک دے پنجابی شاعر (تحقیق) ۱۹۹۵ء

☆ اشلوک (بابا فریدؒ کے کلام کا منظوم اُردو ترجمہ) ۱۹۹۹ء

☆ اٹک کے اہلِ قلم (ترتیب وتہذیب) ۲۰۰۰ء

☆ یادگارِ احمد بخش برنگ (ترتیب) ۲۰۰۳ء

☆ چھاچھی بولی۔۔لسانی وادبی جائزہ (تحقیق) ۲۰۰۵ء

☆ اُردو غزل کا تکنیکی، ہیئتی اور عروضی سفر (تحقیق) ۲۰۰۸ء

☆ مکاتیبِ رشید حسن خاں بہ نام ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی (ترتیب وحواشی)

☆ رنگ (غزلیں) ۲۰۰۹ء

فون : 051-9057724

موبائل : 0300-5391140

ای میل : arshad_nashad@yahoo.com

Rang

Arshad Mahmood Nashad



ارشد محمود ناشاد کی غزل پختہ ہے مگر نزاکت کے ساتھ۔ روایت کے ساتھ اُس کا رابطہ استوار ہے مگر جدّت و حرارت کے ساتھ۔ ستاروں پر پاؤں دھرنے سے پہلے وہ خاک سے اجازت طلب کرنا ضروری سمجھتے ہیں اور اسی خاک کو چھان کر وہ آفتابِ تازہ برآمد کرتے ہیں۔ مدتوں کی ریاضت سے ہونے والی تعمیر کا اُنھیں احترام ہے مگر کہنگی گوارا نہیں۔ چناں چہ لب و رخسار سے ہٹ کر غزل میں کُچھ نئے رنگ بھرنا، سوادِ بیاباں سے خوشبو کشید کرنا اور بحرِ بے پروا کو دریا میں آمیز کرنا اُن کی تمنّاؤں میں شامل ہے۔ تفصیل کے لیے ''رنگ'' آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

______ ڈاکٹر خورشید رضوی